ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.8,Issue No.2 (2026)
(April to June)

زیف سید کے ناول "گل مینہ" میں تاریخی و تہذیبی شعور

Historical and Cultural Consciousness in the Zaif Syed`s Novel "Gul Meena"

محمد احسان
ایم۔فل اسکالر، شعبۂ اُردو زبان و ادب، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا
ڈاکٹر محمد یار گوندل
پروفیسر، شعبۂ اُردو زبان و ادب، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا

Muhammad Ehsan
M.Phil Scholar, Department of Urdu Language & Literature, University of Sargodha, Sargodha
Dr. Muhammad Yar Gondal
Professor, Department of Urdu Language & Literature, University of Sargodha

Article Details
Received:
May 20, 2026
Accepted:
May 25, 2026
Online Published:
June 30, 2026

Copyright: © 2026 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract:
Zaif Syed is one of the prominent contemporary Urdu novelists and intellectuals whose literary contributions encompass diverse fields, including history, culture, science, philosophy, and literary criticism. His scholarly approach and profound understanding of historical and cultural discourses distinguish his works within modern Urdu literature. Although Adhi Raat Ka Sooraj introduced him as a significant novelist, it was Gul Meena that established his literary reputation on a broader scale. The novel represents a profound exploration of historical and cultural consciousness by integrating contemporary socio-political realities with historical narratives. Set against the backdrop of the Pakistan-Afghanistan border, it portrays the life of a rebellious woman while simultaneously tracing the ideological and historical origins of terrorism.

Key words: Historical Consciousness, Cultural Consciousness, Terrorism, Historical Narrative, Militant Groups, Benazir Bhutto, ideological objectives

ادب، تاریخ اور تہذیب کا رشتہ ہمیشہ سے وابند رہا اور اس نے انسان کے شعور (فکر) کی تشکیلِ نو میں مرکزی کردار ادا کیا۔ یہ وہ رشتہ ہے جس کی نوعیت، معنویت اور سمت میں مسلسل تبدیلیاں درپیش آتی رہتی ہیں۔ تاریخ، تہذیب کو معروضیت اور واقع کی صداقت تک محدود رکھا گیا اور ادب کو صرف تاریخ و تہذیب کا عکس قرار دیا گیا لیکن مرورِ وقت کے ساتھ ساتھ دنیا میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ان کا براہِ راست اثر انسانی شعور پر پڑا تو انسان نے اپنی تاریخ اور تہذیب سے کچھ نئے پن کے لیے جستجو شروع کر دی۔ بعد ازاں، تاریخ اور تہذیب کے بیانیے صرف واقعات کے تیقن تک اور متنی ہیر پھیر تک محدود نہیں رہے بلکہ ہر شعبہ ہائے زندگی میں تشکیلِ نو کی حیثیت کے عمل سے گزرنے لگے۔ نو تاریخی دبستان کے مطابق ادب اور تاریخ کی اپنی جداگانہ حیثیت ہے اور

دونوں ہی تہذیب اور سماج کی عکس بندی کے معترف ہیں۔ تاریخ اگرچہ بیتے لمحات کی ورق گردانی سہی لیکن تہذیب ایک ایسا عمل ہے جو ایک جگہ پر وقوع پذیر ہوتا ہے اور صدیوں تک بار بار دہرایا جاتا ہے تب جا کر یہ تکمیل تک پہنچتا ہے، لیکن یہ عمل جامد نہیں ہے بلکہ اس میں مسلسل تغیرات جنم لیتے رہتے ہیں۔ در حقیقت تاریخ و تہذیب کی تعریف اتنے ہی ممکنات میں سے ہے کہ تاریخ زماں کا، اور تہذیب مکاں کا نام ہے۔

انسائیکلوپیڈیا امریکانا کے مطابق:

> "History is the past experience of mankind, more exactly, history is the memory of that past experience as it has been preserved, largely is the return record. In the usual sense, history is the product of the historian's work in reconstructing the flow events from the original written traces or sources into a narrative account."(1)

تاریخ تحریری صورت میں پیش کی جاتی ہے یا نسل در نسل بیان کی جاتی ہے۔ کسی بھی ملک، ریاست یا خطے کی حتمی تاریخ کہیں بھی میسر نہیں اور نہ ہی ماضی کسی کا اتنا تحقیق و تدقیق کے ساتھ میسر ہے، بس اب جو تحریری صورت میں موجود ہے اور جو بیان کر دیا گیا ہے وہی اب تاریخ ہے اور اسی پر شعوری طاقت کا اطلاق کر کے ہم تاریخ کے اوراق سے کچھ نہ کچھ نیا منضبط کر سکتے ہیں۔ ماضی جامد نہیں بلکہ انسان خود اس کو تخلیق کرتا ہے اور انسان ہی اس کا ذمہ دار بھی ہے۔ بس جس بیانیے کے تحت واقعات کی ترسیل ہوئی اب وہی تاریخ کا مقدر ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ تاریخ میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ تاریخ میں جگہ (space) اور وقت (time) کا تعین اہمیت کا حامل ہے۔ تاریخ کی پوری عمارت ہی جگہ اور وقت کی تھیوری پر کھڑی ہے کیونکہ سپیس اور ٹائم میں سے گزری ہر چیز ماضی کا حصہ بن جاتی ہے۔ سپیس اور ٹائم کا ایک ایک لمحۂ قلیل تاریخ کی بازگشت ہے۔

> "History deals with the time and place for which there are written records. Where there, never existed or have disappeared, we can find out that happened from evidence of things from bones, tool and similar objects." (2)

جدید اور مابعد جدید تھیوری نے بہت سے علوم و فنون کی ساخت بدل دی وہاں تاریخ کو بھی شاہنامہ سے انسان نامہ تک کا سفر کروایا دیا۔ ماقبل جدید محض حکمرانوں کے کارناموں کو ہی تاریخ کے زمرے میں شامل کیا جاتا تھا اور یہ بات اتنی تشویش ناک ہے یا تاریخ کے ساتھ ظلم کے مترادف ہے کہ دنیاوی شہنشاہوں کے حالات، ان کے وزیروں کے حالات اس قدر مفصل انداز میں موجود ہیں، جبکہ تمام پیغمبروں کا احوال تاریخ کے اوراق میں شاذونادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کے بقول:

> "تاریخ میں یہ موضوع زیرِ بحث رہا ہے کہ فرد تاریخ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے یا نہیں؟ اس کے برعکس سماجی، سیاسی اور معاشی قوتیں ہیں جو تاریخ کو بدلتی ہیں، دانشوروں اور مفکرین کے نظریات ہیں جو تاریخ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم تاریخ کو لکھتے نہیں ہیں، اگر لکھتے ہیں تو اس میں سے ذمہ دار لوگوں کو جو جرائم میں شریک تھے خارج کر دیتے ہیں۔" (۳)

تہذیب / ثقافت ایک وسیع الجہت اصطلاح ہے۔ یہ ہندی لفظ سے سنسکرت کا اردو ترجمہ ہے۔ انگریزی میں یہ لفظ جرمن زبان کے لفظ Kulture کے وساطت سے آیا۔ ماہرین نے ثقافت کی تعریف اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ لنٹن ثقافت کو سماجی ورثہ قرار

دیتا ہے۔ لاوی ثقافت کو معاشرتی قدروں کی پاسدار کہتا ہے۔ ولیم پکتھال ثقافت کو انسانی دل اور دماغ کی قوت کہتا ہے۔ پارسنز کہتا ہے کہ ہر عملِ مسلسل جو وراثت میں انسان کو ملے اس کا نام تہذیب ہے۔ میتھیو آرنلڈ نے بہت عمدہ ثقافت کی تعریف کی ہے کہ اس عالمِ انسانی میں جو باتیں اچھی کہی گئیں اور سوچی گئیں وہ ثقافت ہیں۔ معروف ماہر لسانیات اے۔ بی ٹائیلر نے اس اصطلاح کی صراحت اس طرح کی ہے:

> "ثقافت (کلچر) وہ پیچیدہ عنصر ہے جس میں اخلاق، قانون، رسم و رواج، تمام صلاحیتیں اور عادات و خصائل شامل ہوتے ہیں جن کو انسان سماجی حیوان ہونے کی بنا پر حاصل کرتا ہے۔" (۴)

تہذیب و ثقافت انسان اور اس سے وابستہ معاشرے کی زندگی کی علم بردار ہے۔ کلچر کی ڈائیورسٹی بہت حد تک وسیع ہے کسی ایک پہلو کو مدِ نظر رکھ کر کلچر کو مقید نہیں کیا جا سکتا۔ کلچر سے تعلق ہی انسانی شعور کی پختگی کو احساس فراہم کرتا ہے۔ اصل میں انسان خود کی زندگی نہیں جی رہا ہوتا بلکہ اس کے افعال و اعمال کا تعین تہذیب کے اصول ہی طے کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تہذیب و ثقافت کا لفظ نیا ہو لیکن لٹریچر کی اساس اسی پر قائم ہے اور کسی نہ کسی طرح ادب کی ترجمانی ثقافت ہی کے ذریعے سے ہو رہی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر تہذیب کسی بھی ملک، ریاست یا قوم کا معاشی و سیاسی نظام، علوم و فنون اور مذہبی و اخلاقی قدروں کی ترجمان ہے۔ جب ایک قوم فیصلہ کن مراحل میں داخل ہوتی ہے تو یہ کہنے میں کوئی نہیں کہ وہ قوم اب ایک مہذب رویوں کی طرف گامزن ہو چکی ہے۔ ہاں صرف مل جل کر رہنا اور انسانی تعداد کی آبیاری کرتے رہنا تہذیب کے پروردہ ہونے کا نام نہیں بلکہ اپنی تخلیقی مقصد کو سمجھ جانا، یہی اصل تہذیب کی شناخت ہے۔ عصرِ حاضر میں تہذیب کا لفظ بار بیرن (غیر متمدن) اقوام کے متصادم استعمال کیا جاتا ہے۔ یورپ میں اس چیز کا تصور زیادہ وسیع پیمانے پر سامنے آیا کہ روس کا شریف وحشی جو اپنے پیروکار میں قابل عبرت نگاہ سے دیکھا جاتا تھا وہ بھی تہذیب کے دائرے میں نہیں آسکا۔ فرانس لوئی تو پوری دنیا کے مقابلے میں خود کو بہت زیادہ مہذب تصور کرتا تھا اور آج بھی یہی تصور فرانس میں مقبول ہے۔ بہر حال شاید وقت کی ضرورت بھی اس وقت یہی ہو حالانکہ اس کے لیے پہلے شائستہ اور پولیس کے لفظ تک استعمال ہوتے رہے ہیں۔ فرانس سے ہی تہذیب کا لفظ مقبول خاص و عام ہوا اور یہیں سے اس کے ساتھ کلچر کا لفظ بھی منقلب ہوا۔ سسرو (cicero) نے اس کا پہلی بار استعمال اپنی تحریروں میں کیا۔ پہلے اس لفظ کو آرائش و زیبائش کے لیے مستعمل سمجھا جاتا تھا، لیکن کلچر کے لفظ کا استعمال اتنا کثرت کے ساتھ کیا گیا کہ تہذیب کی ہم پلہ ہو گیا۔ یہ لفظ آپس میں اس قدر نتھی ہوئے کہ برلن میں دیے گئے ہیگل کے لیکچروں میں ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتے رہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> "کلچر ایک ایسی قوت ہے جو سوسائٹی کے بطن سے پیدا ہو کر باہر کو لپکتی ہے جس طرح بعض اوقات سوسائٹی کا ایک حصہ یک لخت خانہ بدوشی اختیار کر لیتا ہے اور نئی قدروں کو وجود میں لاتا ہے۔ کلچر ایک تجربے کی مانند ہے جو ہمیشہ نئی سرزمین کو اپنی تگ و تاز کے لیے منتخب کرتا ہے اور اس سوسائٹی کو پہلے سے زیادہ توانا، کشادہ اور گہرا کر دیتا ہے۔" (۵)

کلچر کا رجحان پوری دنیا میں بہت تیزی سے پھیلا جیسے مغرب نے ٹیکنالوجی میں ترقی کی اس ترقی کی بدولت ہی پوری دنیا نے اس کے کلچر کو اختیار کرنا شروع کر دیا۔ سوال اب یہ ہے کہ اگر ساری دنیا ایک ہی رہِ سفر اختیار کرے تو کیا ان کے درمیان مماثلت پیدا

ہو جائے گی؟ کیا ہر جگہ جدید ٹیکنالوجی، خوبصورت عمارتیں، جدید ٹرانسپورٹ اور دیگر آلات قوموں کے درمیان کلچر کی ڈائیورسٹی میں معاون ہیں۔ کیا ان کی تقسیم مساوی اصولوں پر ہو سکے گی؟ شاید اس لیے سوی لائزیشن کا تصور اب مثلوم ہو چکا ہے۔ اب تو دنیا ایک نئی سویلائزیشن کی طرف گامزن ہے اب یہ اچھا ہے یا برا اس کا فیصلہ تو وقت ہی طے کرے گا۔ ڈاکٹر شاہد نواز کے بقول:

> "جدید مادی ترقی تو گزشتہ پانچ چھ صدیوں میں زیادہ برق رفتاری سے سامنے آئی ہے، مگر علوم و فنون کی ترقی خصوصاً فنونِ لطیفہ بہت پہلے سے انسانی تہذیب کے ساتھ وابستہ ہیں۔ آج انسان کی ترقی کا معیار جانچنے کا پیمانہ بلاشبہ سائنس اور دیگر علوم ہیں مگر ایک وقت تھا جب فنونِ لطیفہ ہی ترقی کا پیمانہ تصور کیا جاتا تھا۔"(۶)

تاریخ در حقیقت لغزش ہائے انسانی کی کہانی ہے جس کی مدد سے ہم ماضی میں برتی گئی غلطیوں سے عبرت حاصل کرتے ہیں اور جس میں ہمارے ہیروز سے ہوئے اچھے برے محاسن کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ہم نے اپنا محاسبہ ہمیشہ تاریخ کے اوراق سے کیا۔ ماہرین اسی کو تاریخی شعور کا نام دیتے ہیں۔ کسی بھی قوم کے مہذب ہونے کی داستان صدیوں پر محیط ہے یہ سفر ہے کوئے جاناں یہاں قدم قدم پر بلائیں اپنا منھ کھلے بیک وقت تیار کھڑی ہیں۔ وقت کے ظلم و جور نے انسان کو باربیرن سے مہذب بننے کا سفر طے کروایا ہے۔ جیسے جیسے انسان نے زندگی کا سفر طے کیا تو انسان کا تہذیبی شعور بڑھتا گیا۔ آج انسان ترقی کی جس نہج پر ہے یہ سارا کمال تہذیبی شعور کا ہے۔ لہٰذا اصل موضوع کی طرف بڑھنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ قاری کو باور کروایا جائے کہ تخلیقی ادب کے بہجت و بشاشت کا دارومدار تاریخ اور تہذیب کے بنا ادھورا ہے۔ ادب سماج کے حدود و قیود سے ہٹ کر کبھی بھی تخلیق نہیں کیا جا سکتا اگر یہ بے کار کاوش ادیب کرتا بھی ہے تو اس کے اصل وژن کی ترسیل قاری تک مفقود ہو جائے گی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ زرخیز ذہن ہی عظیم تہذیبوں میں پروان چڑھتے ہیں۔

ادب فقط ایک دلکش اور دلفریب الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ کسی قوم کی تاریخ اور ثقافت کا علم بردار ہے اور اس کے سائے کے نیچے ہی تو تاریخ و تہذیب نے پناہ لے رکھی ہے۔ تاریخ و تہذیب کی عکاسی سب سے پہلے داستانوں کے ذریعے کی گئی۔ مقبول ترین اردو داستانوی ادب جس کی وساطت سے ہر مخصوص خطے کی تاریخ اور تہذیب کو اجاگر کیا گیا۔ چاہے وہ داستان امیر حمزہ ہو، باغ و بہار ہو، فسانہ عجائب ہو یا رانی کیتکی کی کہانی یہ تمام داستان مختلف خطوں کی تہذیب اور تاریخ کی پیشکش ہیں۔ مشینی دور شروع ہوا تو وقت کی قلت کا احساس انسانی زندگی میں رونما ہوا تو ان داستانوں کی پڑھت متاثر ہونا شروع ہو گئی۔ اب ضخیم داستانوں کی ورگردانی کا وقت اب انیسویں اور بیسویں صدی کے انسان کے پاس نہیں تھا۔ اس دور میں ایک ایسی صنف (ناول) مقبول ہوئی جس میں ان داستانوی مافوق الفطرت اور عقلِ انسانی سے بعید از فہم کرداروں اور قصوں کے بجائے ایک حقیقی زندگی کو پیش کیا گیا۔ مغربی دنیا نے اس صنف کو بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ انسان نے اپنی تاریخ اور تہذیب کو اس صنف میں سمونا شروع کر دیا یہاں تک کہ اب مقصد کے تحت ناولوں کی تخلیق ہونے لگی اور اپنی تاریخ و تہذیب کو نسلِ نو کے لیے سبق آموز بنا دیا۔

اردو ادب کے ہر نامور ادیب نے اپنا تخلیقی مواد تاریخ و تہذیب کے عناصر سے مستعار لیا اور ان میں ایک ہم عصر ادیب زیف سید بھی ہیں۔ ان کا شمار عہدِ حاضر کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی تحریروں کے اچھوتے پن کے ذریعے بہت جلد دنیائے ادب اپنا نام بنایا ہے۔ زیف سید افسانہ نگار، ناول نگار، عمدہ شاعر اور اعلیٰ پائے کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ ان کا سب سے پہلا ناول ''آدھی رات کا سورج'' جس نے زیف سید کو ادبی دنیا میں متعارف کروایا۔ یہ ۲۰۱۳ء

میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ ایک ایسا ناول تھا جس میں تاریخی و تہذیبی حوالے سے ایک انوکھا تجربہ کیا گیا کہ اس میں فکشن، نان فکشن، حال ،ماضی، مستقبل کا دل چسپ انداز میں برملا اظہار کیا گیا۔

"گل مینہ" زیف سید کا دوسرا ناول ہے۔ اس کی اشاعتِ اول ۲۰۱۹ء میں ہوئی۔ دوسری بار نومبر ۲۰۲۴ء میں بک کارنر نے اسے شائع کیا۔ اس کتاب کا انتخاب "بے نظیر بھٹو کے نام" سے ہے۔

یہ ناول ان کے تاریخی و تہذیبی شعور کو اجاگر کرتا ہے۔ اس ناول میں انہوں نے جنوبی وزیرستان میں عورت کی حیثیت، نو آبادیاتی عہد کی ستم ظریفی اور اس کے مقامی لوگوں پر اثرات، دہشت گردی کے لیے ذہن سازی کی ہتھکنڈے، حسن بن صباح، احمد شاہ ابدالی اور بے نظیر بھٹو کے قتل جیسے تاریخی واقعات اور شخصیات کے ذریعے اپنے تاریخی و تہذیبی شعور کو بامِ عروج پر پہنچا دیا ہے۔ یہ ناول تاریخی نقطۂ نظر کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہے کیوں کہ انھوں نے اسے جدید ادبی تھیوری کے مطابق صفحہ قرطاس پر اتارا۔ کہانی کا آغاز گل مینہ جیسی بہادر لڑکی سے شروع ہوتا ہے۔ ایسی لڑکی جو پدرسری نظام میں بغاوت کی علامت ہے، یہ لڑکی ہر اس عورت کی داستان ہے جو ایسے معاشرے میں پسماندگی اور سماج کے بنائے سخت ترین قوانین کے خلاف اپنی آواز بلند کرتی ہے۔ گل مینہ کا سفر اپنے گاؤں سے شروع ہوتا ہوا اور دربدر زندگی کی ٹھوکریں برداشت کرتے ہوئے افغانستان و پاکستان میں جاری جنگی حالات سے نبرد آزما ہوتی، روایات کی تدبیر کرتے ناخداؤں کے خلاف اپنے نسائی شعور کی بدولت بھینٹ نہ چڑھنے والی پشتون لڑکی کی داستانِ زندگی ہے۔ ایسا معاشرہ جہاں عورت محض عیاشی کی علامت سمجھی جاتی ہو، اسے صرف نسلِ نو کی پروڈکشن کا ساماں سمجھا جاتا ہو تو ایسے معاشرے میں گل مینہ کا ان سارے اصول و ضوابط کو تار تار کر کے اپنے حق کی زندگی جینا ایک باشعور عورت کی عکاسی کرتا ہے۔ جو اپنی زندگی اپنی طرز پر بسر کرنا چاہتی ہے نہ کہ کسی کی مفاد کی خاطر چند ٹکوں کے عوض کسی کی گھر کی زینت بنادی جائے۔ جب گل مینہ کے بھائی اسے پچاس ہزار و لوار کے عوض ملک عطا خان کو بیچ دیتے ہیں تو گل مینہ شعوری طور پر مضبوط ہونے کے سبب اپنی زندگی کسی کے کہنے پر بسر نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے اس نے اپنے دادا کی پسند زرجانان کے ساتھ گھر سے بھاگ جانا ہی مناسب سمجھا۔

> "پتا نہیں قصور کس کا تھا بڑے بھائی کا جو پچاس ہزار لے کر اسے اگلے جمعہ بڈھے کھوسٹ ملک عطا اللہ جان کے کونٹے سے باندھنا چاہ رہے تھے، جس کے چند بچے کچے دانت نسوار کھا کھا کر پیلے پڑ گئے تھے، اور جو ہنستا تھا تو لگتا ہے کہ کھانس رہا ہے اور جب کھانستا تھا تو لگتا تھا ہنس رہا ہے، ساری زندگی ملکیانی بن کر راج کرے گی، راج 'سب یہی کہتے تھے۔" (۷)

گل مینہ کا اس طرح گھر سے بھاگنا ہی درحقیقت اس نظام یعنی اس تہذیب کے خلاف بغاوت تھی۔ گل مینہ جب گھر سے بھاگ جاتی ہے۔ زرجانان اگرچہ سفر کی دشوار گزار گھاٹیوں سے واقف تھا لیکن خوف اور ذہنی ہیجانات کی وجہ سے وہ راستہ بھول گیا اور بار بار ایک ہی جگہ پر پھر آنکلتے تھے۔ تکلیفوں اور مصیبتوں کے سفر میں گل مینہ کے پاؤں شدید زخمی ہو جاتے ہیں اور وہ کچھ دن سنگین خان کے گھر پناہ لیتے ہیں۔ پاؤں زخمی ہونا اس ستم زدہ تاریخ اور ثقافت کی عکاسی ہے جس میں عورت کی زندگی وبالِ جان بنی ہوئی ہے۔ گل مینہ اور زرجانان کے لیے سب سے تعجب کی بات یہ تھی کہ یہ دونوں اب پاکستان کی سرزمین پر نہیں بلکہ گنگے کوٹ افغانستان کی سرزمین پر کھڑے تھے، کچھ دن گنگے کوٹ میں رہائش پذیر ہونے کے بعد سنگین خان کو ان کو قندھار جانے کا کہتا ہے اور وہاں پر زرجان کے روزگار کا

بھی بند بست کر دیتا ہے۔ انسان کا شعور بہت سی انسانی یادوں کی آماج گاہ ہوتا ہے چنانچہ گل مینہ یہاں چند دن قیام کرنے کے بعد بہت سی یادوں میں کھوئی رہتی ہے۔ اسے اپنے گاؤں کا یاد آنا، والدہ کی موت، دادا کی محبت، تھری نائٹ رائفل سے عشق کیونکہ یہ اس کی وراثتی نشانی ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں اس کے دل کو بے چین رکھتی ہیں۔

گل مینہ اور زرجانان جب قندھار کی سرزمین میں داخل ہوتے ہیں تو اس شہر کی سرد بھری داستانیں ان کو بہت سی ذہنی یادوں میں مسحور کر دیتی ہیں، گل مینہ نے اس شہر کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اسی دوران گل مینہ کی وجود میں دوسرے وجود کی کرن پھوٹ پڑتی ہے اور ان کا بیٹا فتح خان اس سرزمینِ مشکلات میں آنکھ کھولتا ہے۔ لہٰذا اب فتح خان، زرجانان اور گل مینہ کی زندگی ان حسین پگڈنڈیوں پر دوڑ پڑتی ہے جس کا خواب گل مینہ نے بچپن سے دیکھ رکھا تھا۔ اب اس ناول میں زیادہ تر ماضی کی یادوں کو دہرایا گیا ہے اور ان کو بیان کرنے کے لیے گل مینہ کے کردار کا سہارا لیا گیا۔ فتح خان کا نہ بولنا گل مینہ کو بہت تشویش اور اضطراب میں رکھتا تھا جو کچھ کسی سے سنا اسے آزمایا، کسی نے کہا کہ عبداللہ انصاری کے مزار پر جا کر منت مانو یعنی صرف فتح خان منھ سے بولے اس کی خاطر زرجانان اور گل مینہ نے جتنا ہو سکا انہوں نے کیا۔ یہ وہ ثقافتی جبر تھا کہ جہاں انسان کو مکمل علاج کی ضرورت تھی وہاں وسائل کی عدم تقسیم نے انسان کا بنیادی حق چھین کر اسے سماجی توہمات کا پروردہ بنا دیا۔ لیکن جہاں وقت کو عروج ہے تو اسی لمحے سریع الزوال بھی ہے، زرجانان حسبِ عادت اپنی گاڑی میں برجمان ہوتا ہے کہ چند لوگ اس کی گاڑی میں آکر سوار ہوتے ہیں اور اس سے بولدک کی طرف گاڑی لے جانے کا حکم دیتے ہیں۔ گاڑی میں سوار لوگ کلاشنکوف سے لیس ہوتے ہیں اس طرح اس گاڑی پر سوار کمانڈر سے زرجانان کی گفت و شنید چلتی رہتی ہے۔ بولدک پہنچنے کے بعد گاڑی کماندار ایک حویلی کے پاس کھڑی کرواتا ہے اور پھر وہ سارے اتر کر اسی حویلی میں چلے جاتے ہیں۔

اسی طرح گل مینہ اور زرجانان کی کہانی آگے بڑھتی ہے۔ ایک دن زرجانان کہیں سے ایک ٹکڑا کپڑے کا لاتا ہے اور اسی ٹکڑے کی ساری کہانی وہ گل مینہ کو بتاتا ہے کہ یہ ملّا عمر نے آج خرقہ رسول ﷺ فضا میں بلند کیا اور میں یہ کپڑا اس سے مس کر کے لایا ہوں، ہو سکتا ہے اس کی برکت سے فتح خان کی زبان میں حرکت آئے، پھر جو ملّا عمر نے جو بتایا تھا کہ یہ بابائے جدید افغانستان احمد شاہ ابدالی کس طرح بخارا سے اسے قندھار میں لائے تھے، شاہ امان اللہ نے ایسے فضا میں بلند کیا تھا اور طاعون کی بیماری سے پناہ حاصل کی تھی۔ یعنی لفظ بہ لفظ جو کچھ ملّا عمر نے کہا زرجانان نے وہی گل مینہ کو بتا دیا۔ چناں چہ زرجانان اس سے ایک قیمتی تحفہ سمجھ کر گل مینہ کو پیش کرتا ہے۔ ہماری تاریخ اسی طرح کی ستم ظریف حربوں سے بھری پڑی ہے۔ گل مینہ اس ناول میں ناسٹلجیا کا شکار نظر آتی ہے وہ فتح خان کو (اپنے دادا جان سے جو جم خان نے زیادتی کی تھی اور ان کے پیسے ہڑپ لیے تھے)، وہ سب بتاتی ہے۔ گل مینہ اکثر اس دکھ اور غم میں رہا کرتی تھی کہ وہ اب کبھی بھی شوال نہیں جا سکے گی۔ کہانی اپنی ڈگر پر رواں ہیں گل مینہ اور زرجانان کو پاؤ جان کا بسایا ہوا گھر جو اب ایک دہشت کا منظر پیش کر رہا تھا مل جاتا ہے، اس طرح یہ دونوں مل کر اس گھر کو سنوارتے ہیں لیکن پھر بھی حالات اتنے کشید تھے کہ گل مینہ اور زرجاناں نے پاکستان جانے کا سوچا، لیکن وقت کو شاید کچھ اور منظور تھا۔

گل مینہ ایک مجاہد سعد اللہ محسود سے نکاح کر لیتی ہے، چند دنوں کے بعد وہ ایک راکٹ لانچر میں مارا جاتا ہے۔ فتح خان تو اپنے والد زرجانان کے علاوہ کسی اور کو باپ کا درجہ دینے کے حق میں نہیں تھا۔ گل مینہ نے جب تیسرا نکاح کیا تو فتح خان نے گھر چھوڑ دیا اور ایک مدرسے میں جا کر فدائی بن گیا۔ ایک دن فتح خان کا دوست صدیق گل مینہ کے پاس خبر لے کر آتا ہے کہ فتح خان ایک مدرسے میں زیرِ تعلیم ہے اور وہاں مصنوعی جنت بنا کر ذہن سازی کی جاتی ہے۔ گل مینہ جب اس مدرسے کا پتہ پوچھتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ مدرسے کا پتہ بہت مشکل ہے ہاں اتنا مجھے پتہ ہے کہ اسی پنڈی لے جایا جا رہا ہے۔ گل مینہ اپنی بندوق بیچ کر راولپنڈی روانہ ہوتی ہے۔ جب وہ بس میں سوار ہوتی

ہے تو وہ سارے منظر نامے کو یاد کر کے زار و قطار روتی ہے۔ جس دن گل مینہ راولپنڈی پہنچتی ہے اس دن بے نظیر بھٹو کا قتل کیا جاتا ہے، چند لوگ گل مینہ کو گرفتار کرتے ہیں، تلاشی لیتے ہیں اور اس برقعہ تک پھاڑ دیتے ہیں، لیکن آخر میں یہی دہرایا جاتا ہے کہ چھوڑ دو، یہ خودکش نہیں ہے۔

گل مینہ جب گرفتار ہو کر آتی ہے تو میڈم رخسانہ کو اس کی تفتیش کے لیے تعینات کیا جاتا ہے، جو اپنے کریکنگ ریکارڈ کی وجہ سے کافی کامیاب پولیس افسر تھی لیکن یہ کیس اس کے گلے پڑ گیا کیونکہ گل مینہ نے اپنا منہ تک نہیں کھولا۔ جب گل مینہ کو تفتیش کے بعد لے جایا جا رہا ہوتا ہے تو اس دوران وہ ایک کمرے میں فتح خان کا اسکیچ دیکھتی ہے جسے شفیق رنگساز نے بنایا ہوتا ہے۔ بس گل مینہ جب یہ اسکیچ دیکھتی ہے تو وہ میڈم رخسانہ کو سب بتانے پر رضامند ہو جاتی ہے لیکن ایک شرط پر کہ وہ فتح خان کا سر اس کے حوالے کرے گی۔ شفیق گل مینہ کو بتاتا ہے کہ فتح خان کا سر اسی عمارت میں ہے، اگر تم میڈیا کا سہارا لیتی ہو تو شاید یہ سر تمہارے حوالے کر دیں لیکن شفیق کسی طرح گل مینہ کو یہ بھی مشورہ دیتا ہے کہ یہ لوگ تمہارے ساتھ بھی کچھ برا سلوک نہ کر دیں اس لیے تم وزیرستان لوٹ جاؤ لیکن گل مینہ تو اپنا آپ بھلا چکی تھی اسے ہر صورت فتح خان کی قبر بنانی ہی تھی۔ اسی ایما پر گل مینہ میڈیا کا سہارا لیتی ہے تو بات صاحبانِ اقتدار اور این جی اوز (NGOs) تک پہنچ جاتی ہے تو سرکار کس طرح گل مینہ کو فتح خان کا سر دکھانے پر رضامندی کا اظہار کرتی ہے۔ جب میڈیا کا پریشر بڑھ جاتا ہے تو اس سارے معاملات کو راجہ جاوید اکرم سنبھالتے ہیں، میڈم رخسانہ کی نوکری بھی خطرات کی نظر ہو جاتی ہے لیکن آخر کار وہ اسے ایک عمارت میں میں لے جاتی ہے جہاں بہت ساری انسانی کھوپڑیاں الگ الگ مرتبان میں پڑی ہوتی ہیں۔ گل مینہ فتح خان کے سر کو دیکھ کر سکتے میں آ جاتی ہے اور ایک میز کو کھینچنے کی صورت میں کچھ محلول زمین پر گر جاتے ہیں اور عمارت میں آگ لگ جاتی ہے۔

اس ناول کے محرکات میں سب سے اہم محرک عورت ہے جو شمالی سرحد پر آباد ہے اس کی زندگی کو موضوع بنایا گیا۔ اس عورت کی زندگی جس نے صدیوں سے قربانیاں دیں، اپنی خواہشات کو پدرسری خاندان پر کسی طرح کی آنچ نہ آنے اور اس عورت کی زندگی کو موضوع بنایا تھا کہ جس کے چلتے وزیرستان میں اس صنفِ نازک کے سماجی و اقتصادی پہلو کو اجاگر کرنا تھا۔ تہذیب اور تہذیبی شعور کی جب بھی بات آ جائے تو عورت کی سماجی قدر کو ہر صورت ہی تحریر کا حصہ بنایا جاتا ہے۔ وزیرستان اور پاک افغان سرحد پر آباد ایک ایسی عورت کی کہانی جو اس وقت کے سماجی قدروں کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی اور ان زنجیروں میں پابندِ سلاسل ہونے کے بجائے زندگی اب اپنے اصولوں پر گزارنے کی ہمنوا تھی۔ اس لیے تو زیف سید گل مینہ کی وساطت سے اس خطے کی عورت کی بہادری، قربانی اور زندگی کے ملال انگیز پرتوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ وزیرستان اور پاک افغان سرحد پر مکین عورت کی زندگی بس ایک ورکر کسی ہے جو اپنے خاوند، بیٹے کا ہاتھ بٹانے یا مرد کی تسکین کے لیے ہی پیدا کی گئی۔

اس علاقے میں کھیتی باڑی کا اثر و رسوخ زیادہ ہے اور آمدن والے کاموں میں عورت کی شمولیت بہت قلیل پیمانے پر ہے۔ بہت سے لوگوں نے اپنا ایک ملکیتی نظام بنایا ہوا ہے اور عورتیں اس میں کسی حد تک معاون ہوتی ہیں تاہم باوجود اس کے اس علاقے میں سرکاری اور دیگر جو این جی اوز کام کرتی ہیں ان میں شمولیت اختیار کر چکی ہیں۔ وزیرستان کی پسماندگی میں بہت سی فیکٹرز کا کارفرما ہیں، اس خطے میں عسکریت پسندی اور دہشت گردی نے ہمیشہ ایک ظالمانہ کردار ادا کیا ہے۔ جس کی بدولت یہ خطہ سماجی، اقتصادی اور تہذیبی حوالے سے بہت پیچھے رہ گیا اور پھر جب یہ فیکٹرز کمزور پڑ جائیں تو جہاں مرد کی زندگی متاثر ہوتی ہے وہاں عورت ذات کی زندگی میں بھی مشکلات بسیرا کر لیتی ہیں۔ اس خطے میں پچھلے دس سال کا لٹریسی ریٹ ۳۱٫۳ فیصد ہے جو کہ باقی خطوں کی بانسبت بہت کم ہے۔

"سہیلیوں نے بتایا کہ مس فرزانہ کو علاقے کے ملک عطا نے دھمکی دی ہے کہ سکول آنا چھوڑ دے ورنہ اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔ ان پر الزام تھا کہ وہ لڑکیوں کو خراب کر رہی ہے مس فرزانہ نے پشاور کے کالج سے پوری بارہ جماعتیں پاس کی تھیں۔ اس کا باپ وہاں کسی محکمے میں افسر تھا اور ریٹائر ہونے کے بعد شمال آ کر بسا تھا۔ اسی نے دوڑ دھوپ کر کے علاقے میں پہلی مرتبہ لڑکیوں کے لیے سکول کھلوایا تھا۔ بعد میں گل مینہ کو معلوم ہوا کہ ملک عطا نے مس فرزانہ کو کسی دن سکول جاتے ہوئے دیکھا اور اسی شام اس کے باپ سے رشتہ مانگا تھا۔ انکار پر اس نے سکول ہی بند کروا دیا۔(۸)

لڑکوں کی تعلیم تو کسی حد تک بہتر ہے لیکن اس کے مقابلے میں عورتوں کا لٹریسی ریٹ بہت کم رہ جاتا ہے۔ اس کی وجہ اس علاقے میں تعلیمی سہولیات کا فقدان اور کچھ دقیانوسی سوچ ہے۔ زیف سید نے اس سماجی جبر کو اپنے تہذیبی شعور کا حصہ بنایا ہے کہ کس طرح اس خطے کی عورت بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم ہے، سماجی جکڑ کتنی سخت ہے کہ ایک آزاد اڑان والے کو بھی قید کر لیتی ہے اور اپنے بنائے اصولوں کے تابع کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ گل مینہ کا تعلیم حاصل کرنا اور وہاں کے عطا محمد خان کا مس فرزانہ کو اپنے علاقے سے نکال دینا کہ وہاں کی لڑکیوں کو ذہن سازی اور بغاوت پر اکسا رہی ہے اس معاشرے کی تصویر کا رخ واضح کرتا ہے کہ وزیرستان کی سرزمین تہذیبی جبر میں کس قدر گھر چکی تھی۔

کہانی کا دوسرا رخ نو آبادیاتی عہد کی طرف اشارہ کرتا ہے کہانی نیاز بین کی کردار سے شروع ہوتی ہے جب انگریزوں کی پلٹن کو اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ اب قبائل اکٹھے ہو کر ان کے خلاف جہاد کی سوچ رہے ہیں تو وہ اپنے بیرک میں سے انخلا کا منصوبہ بناتے ہیں۔ نیاز بین کو اصطبل کی دیکھ بھال پر مامور کیا جاتا ہے کہ پلٹن کا یہاں سے انخلا ہونا ہے تو اس کے لیے کتنے جانور درکار ہوں گے وہ ساتھ لے کر باقی کو مار دیا جائے گا۔ میجر رسل اور نیاز بین کے درمیان بہت سے امور پر گفت و شنید ہوتی ہے۔ میجر رسل حکمت عملی کے تحت نیاز بین سے بھی اسلحہ واپس لے لیتا ہے کہ اگرچہ فرنگی قیادت کے ساتھ تمہاری بہت وفاداریاں ہیں لیکن صورتحال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اب یہ اشد ضروری ہے کہ منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے کسی پر اعتبار نہ کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مالک دین تختِ برطانیہ کے ساتھ دھوکا کر چکا تھا اس لیے نیاز بین سے یہ سلوک کرنا پڑا۔ پھر جب فورس سینڈی میں پہنچتی ہے تو وہ نیاز مین سے تحریری معافی بھی مانگی جاتی ہے اور ترقی بھی دی جاتی ہے، اس طرح نیاز بین صوبیدار نیاز بین بن جاتا ہے۔ پھر جن قبائلیوں نے انگریز حکومت کے ساتھ غداری کی تھی تو بطورِ عبرت گاؤں کو مسمار کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، جس کی ابتدا موسیٰ نیکہ جو نیاز مند بین کا گاؤں تھا وہاں سے کی جاتی ہے۔ نیاز بین پر افسردگی کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ یہ سوچتا ہے کہ گورے کی زہانت الگ ہی فطرت کی متحمل ہے کہ ایک گاؤں نے بغاوت کی صرف یہ کہ تین سور قم جمع نہیں کروائی جبکہ اسی گاؤں کو عبرت سکھانے کے لیے تین لاکھ کا مزید خرچہ کر ڈالا۔

اس کہانی کی شد و مد میں ایک ایکٹ پاؤ جان کے کردار کی صورت میں واضح ہوتا ہے۔ بہت جان کو گورکھا سپاہی سے چھینی ہوئی بندوق پر بڑا ناز تھا۔ پاؤ جان کی نیاز بین سے بڑا یارانہ تھا لہٰذا یہ دونوں بیرک کے میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی ملاقات ایک چرواہے قدرزمان سے ہوتی ہے جسے نیاز بین نے یہ حکم دیا تھا کہ وہ سارے اصطبل کے جانوروں کو مار دے۔ لیکن ایک سیاہ گھوڑی جس کی خدمت وہ پچھلے چار ماہ سے کر رہا تھا اس کو مارنا ہی افسوس کے لیے کافی تھا۔ پاؤ جان رغزہ کی طرف سفر کرتا ہے اور راستے میں وہ ایک طیارے کو گرا

دیتا ہے لیکن محسود اس پر اپنا حق جمانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ انگریز نے اس کے لیے بہت سی رقم مختص کر رکھی تھی۔ دراصل یہ نھی اس غربت کے نام کہ اس نے انسان کے کروفر کے لیے بندوق کو ہی معیار بنا دیا۔ پاؤجان نے جو ایک قیدی انگریز جس کا نام فیئر بو در تھا اس کو انگریز کے حوالے کرنے کی منصوبہ بنایا۔ مدار خان اور سجل خان نے جو جہاز گرانے کا مطالبہ کیا تھا اس کے لیے ایک جرگہ بلایا جاتا ہے لیکن یہ دونوں محسود جرگے کو مطمئن نہیں کر پاتے اور فیصلہ پاؤجان کے حق میں کر دیا جاتا ہے۔ پاؤجان اور یار محمد وہاں سے ایک بیل چوری کرتے ہیں اور ایک طنز پر مبنی خط وہاں چھوڑ کر جاتے ہیں کہ انگریز کے احسان کا بدلہ کس طرح چکایا جائے؟

> "عالی جناب شہنشاہ جارج ہشتم، والیِ ہند و سندھ، والیِ ولایت اور پتہ نہیں والی ہے کیا کیا۔ حضور معظم کا اقبال بلند رہے اور اس کی سلطنت عظمیٰ پر سورج تو کیا چاند اور ستارے بھی کبھی نہ غروب ہوں۔ امابعد عرض ہے کہ آپ کا گراں قدر تحفہ وصول پایا۔ یہ ہم سب قبائل کی خوش بختی ہے کہ حضور شہنشاہ ہماری فلاح کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ ہماری خاطر آپ نے برطانیہ سے دو انتہائی مہنگے اور انتہائی خاندانی بیل بھیجے جن کا شجرہ مبارک حضور معظم کی طرح نجیب الطرفین ہے اور قدیم ہے۔"(۹)

سوال یہ ہے کہ زیف سید نے فلیش بیک کی تکنیک کا برملا استعمال کیوں کیا تو اس کا جواب یہی ہے کہ آج جو تشویش ناک صورت حال بلوچستان اور افغان بارڈر پر ہے اس کا ماسٹر مائنڈ (طالبانئزیشن) بہت سے محرکات کی وجہ سے صدیوں پہلے تیار کر لیا گیا تھا اور اس کے لیے مذہبی بیانیے نے بہت تعاون کیا اور ادیب نے اسی بیانیے کو تاریخی و تہذیبی نقطہ نظر سے اجاگر کیا ہے۔ کسی بھی تاریخی واقع کو سمجھنے کے لیے اس کے پیچھے محرکات کو سمجھ کر ایک ادیب کے شعور کا تہہ در تہہ جہات کو سمجھا جا سکتا ہے۔

ایک ایکٹ شفیق رنگساز کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جو مختلف قسم کی تصاویر ٹرکوں اور ویگنوں پر بنایا کرتا تھا اور اپنے فن میں طاق تھا۔ بابو پینٹر کی شاپ پر کام کرتا تھا اس وقت ٹرکوں کی پیچھے مسرت شاہین کی تصویر بنانے کا بڑا فیشن تھا اور ٹرک ڈرائیور فرمائش کر کے اس کی تصویر بنایا کرتے تھے۔ جب شفیق اپنے فن میں یکسر بے نظیر ہو گیا تو ایک دن اسے چند تاوان کی عوض گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ جو لوگ شفیق کو گرفتار کرتے ہیں ان کا یہی کام ہوتا ہے کہ وہ بڑے بڑے لوگوں کی آل اولاد کو قید کرتے ہیں اور ان کی عوض بھاری رقوم کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن شفیق جیسے معمولی رنگساز کو گرفتار کرنا بعید از عقل تھا۔ بہر حال کہانی میں بہت سے واقعات کا تذکرہ کیا گیا جو بعد از قید شفیق کے ساتھ رونما ہوئے۔ آخر کار ایک خطیب صاحب شفیق کو رہا کروا کر ایک مدرسے میں لے جاتے ہیں اور اسے دیوار پر ایسے نقش و نگار بنانے کا حکم دیتے ہیں جو وہ کبھی ٹرکوں کے سینے پر بنایا کرتا تھا۔ اسی دوران بطورِ معاون فتح خان کو شفیق کے ساتھ کام پر لگایا جاتا ہے اور نصیب گل نے فتح خان اور شفیق کو ہر ضرورت کا خوب خوب دھیان رکھا اور کسی بھی چیز کی کمی نہیں آنے دی۔ خطیب صاحب کے متعلق فتح خان شفیق کو سب بتاتا ہے کہ اصل میں وہ کیا کام کرتے ہیں اور سنا ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے سو کافروں کو قتل کیا ہے۔ شفیق اپنے کام میں مدغم ہو جاتا ہے اور ایک دن خطیب سا ممبر پر برجمان ہوتے ہیں کہ ایک ریموٹ کنٹرول ڈرون ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ تمام لوگ افراتفری میں ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیتے ہیں لیکن خطیب صاحب اپنے ممبر پر بغیر کسی خوف و خطر کے مستقیم رہتے ہیں۔ جب شفیق اپنا کام مکمل کر لیتا ہے تو ایک دن خطیب صاحب اپنے شاگردوں کے ساتھ اسی کمرے میں آتے ہیں جہاں شفیق اپنے فن کا

جوہر دکھا رہا تھا اور شاگردوں کو تصویر کے ذریعے بہشت کے ندی، جھیلوں اور حوروں کی قصہ خوانی اس طرح ادا کرتے ہیں کہ فتح خان تک اپنے جسم میں گرمی محسوس کرنے لگتا ہے۔

ایک دن شفیق اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے کہ زوردار دھماکہ ہوتا ہے اور ہر طرف لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ فتح خان شفیق کو بھاگنے کا مشورہ دیتا ہے تو شفیق جان بچاتے ہوئے ایک گاؤں میں آکر پناہ لیتا ہے وہاں سے اسے چند فوجی پکڑ کر لے جاتے ہیں اور اب اسے انہیں دہشت گردوں کی تصاویر بنانے کا حکم دیتے ہیں کہ اب تک تم نے دہشت گردوں کے لیے کام کیا ہے، اب ریاست کے لیے کرو۔ یہاں سے شفیق فتح خان کے نقشوں نگار ابھارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ فتح خان کی والدہ اس کی شناخت کر لیتی ہیں۔ دہشت گردی کے تمام تر پیتروں کی صراحت اس ایکٹ کی صورت میں ادیب نے اجاگر کی کہ جب شفیق دیواروں کو رنگوں سے سجاتا ہے تو در حقیقت ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو ناپختہ ذہن کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور سیاسی بیانیے کے لیے جہاد کے کنسپٹ (concept) کو مشکل بنا دیتے ہیں اور عام آدمی بہت سی تاویلات کا شکار ہو جاتا ہے۔

زیف سید نے فرقہ باطنیہ، حسن بن صباح کی بنائی گئی مصنوعی جنت، اور احمد شاہ ابدالی کی لوٹ کھسوٹ کے حوالے بھی جگہ جگہ استعمال کیے ہیں کہ دہشت گردی کے جو حربے آج آزمائے جا رہے ہیں ان کی اساسیں بہت پرانی ہیں۔ ایسی ہی خوش نما تعبیریں اور معنی و مفہوم کی بدولت عصرِ حاضر کے طالبانائزیشن انجمنوں نے معصوم دہنوں کو ورغلا کر اپنے ناپاک مقاصد کے بھینٹ چڑھایا۔ فتح خان جیسا معصوم ذہن انھیں دہشت پسند تنظیموں کے ہتھے چڑھا تو جہاں باپ زرجاناں نے اپنی جان فضول میں گنوا دی بیٹا بھی انھیں انسان دشمن لوگوں کے ہاتھوں جان کی بازی ہار گیا۔ پندرہ سالہ فتح خان جب ملّا صاحب کی تربیت میں جاتا ہے تو اسے جذباتی واقعات اور جنت میں حوروں کے اعضا کے قصے سنا کر اس کے دماغ کو مکمل اپنی مٹھی میں کر لیا جاتا ہے پھر زرجانان کی موت کا منظر بھی فتح خان کو بڑے جذباتی کیفیت میں سنایا جاتا ہے کہ فتح خان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔

> "فتح خان اس وقت بھی منھ کھولے ہوئے سربلند خان کی بات سن رہا تھا۔ جب بھی سربلند خان کے ہونٹوں پر زرجانان کے نام آتا، فتح خان کے سینے سے ایک گولا سا اٹھتا اور حلق میں آکر پھنستا۔ اسے سسے بار بار آنکھیں پٹک پٹک کر آنسوں کو نکلنے سے روکنے کی کوشش کرنا پڑتی تھی۔ اس کے باوجود ایک آنسو اس کی بائیں آنکھ کے کونے سے آہستگی سے سرکتا ہوا نکلتا اور رخسار پر آکر ٹک گیا۔ فتح خان نے سوچا کہ اس سے پوچھ دے لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔"(۱۰)

رویس احمد لکھتے ہیں:

> " احمد شاہ ابدالی ہو کہ حسن بن صباح ان جیسے سبھی کرداروں نے اپنے مفادات کے لیے عام عوام کو مہرہ بنایا۔ اپنی اقتدار کو طول دیا۔ عوام کو بے وقوف بنا کر اپنے قصروں کی تعمیر کرتے رہے مگر آج کا قاری ان حقائق سے نابلد ہے، نئی نسل کو بھی ان حقائق سے دور رکھا جا رہا ہے جس کا منہ بولتا ثبوت ہمارا نصاب ہے۔ کب تک ہم اپنے ماضی کے سچ سے خود بھی دور بھاگیں گے اور اپنی نسل نو کو گمراہ رکھیں گے؟"(۱۱)

ایک اور جگہ وہ اسی گمبھیر صورت حال کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

" قبائلی علاقوں میں پنپنے والی ان جہادی کارروائیوں کا دائرہ کار جب پاکستان کے میدانی علاقوں میں پھیلا اور دشمن ممالک نے اپنے مقاصد کے لیے ان گروہوں کی سربراہی کی، تب ان چند مفاد پرستوں نے کیسے ان معصوم بچوں کو جہاد کا سبق پڑھایا۔ ان معصوموں کا نمائندہ کردار فتح خان ہے جو اپنے باپ کے مرنے کے بعد مدرسہ میں آیا مگر دہشت گرد بن کر باہر آیا۔"(۱۲)

زیف سید کا یہ ناول صرف طرزِ اظہار نہیں بلکہ ایک زندگی ہے، ایک ایسی زندگی جس نے اکیسویں صدی کے انسان کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور آج بھی وہی دقیانوسی فکر کے تحت نسلِ نو کی ذہن سازی کی جارہی۔ یہ ناول محض ایک صدی کا قصہ نہیں بلکہ تاریخ و تہذیب کے ان تمام دل خراش واقعات کی از سرِ نو تعبیر ہے۔ حسن بن صباح کی جنت ہو یا شفیق کی دیوار پر بنائی گئی جنت، دونوں کا مقصد انسان دشمن عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ ڈاکٹر نتاشا شاہد لکھتی ہیں:

"نائن الیون کے حملوں کے بعد مسلمانوں کا امیج دنیا بھر میں بری طرح متاثر ہوا۔ اسی طرز کے غیر مسلموں پر کیے جانے والے خود کش حملے کافی حد تک مسلم کمیونٹی کی شناخت کے طور پر پیش کیے جانے لگے۔ جلد ہی چند علمی نظریات اس جدید تصور کی حمایت میں ابھر کر سامنے آئے جن میں سے ایک نظریے نے یہ کوشش کی کہ جدید خود کش حملوں کو اساسین (فدائین) کے ساتھ جوڑا جائے۔"

(۱۳)

زیف سید ہمیشہ سماج کی بات کرتے ہیں ماضی میں گزرا ہر لمحہ زیف سید کے لیے سبق ہے۔ اس لیے ان کے کردار ایک بلیغ استعارہ ہے۔ چنانچہ زیف سید کا یہ ناول اپنی مقصدیت کی بنا پر ایک زرخیز ناول ہے۔ اگر اسے تعصب کی عینک لگا کر نہ پڑھا جائے تو اس میں تاریخی و تہذیبی پہلوں کو ایک نئے جہت کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ اس ناول کا اصل مطمحِ نظر پاک افغان سرحد پر موجود زندگی کے گوشوں کو منظرِ عام پر لانا تھا۔ اگر ایک ادیب کسی سماجی و ثقافتی پہلوں پر توجہ مرکوز کر لیتا ہے تو پھر اس فن پارے میں فنی قباحتیں شمار ہونے لگتی ہیں۔ اگر ایک ادیب سیاسی، تاریخی، سماجی ثقافتی ان میں سے کسی ایک منظر نامے کو اپنے فن پارے پر حاوی کر دے گا تو اس کے فن پارے میں بہت سی فنی نکتہ چینیوں کی گنجائش باقی رہ جائے گی۔ اس طرح بعض فن پاروں پر مذہبی رنگ زیادہ نظر آتا ہے تو اس میں بھی بہت زیادہ مقصدیت کی فضا بن پڑتی ہے اس لیے متوازن راستہ ہی ایک فنکار کو اس کے فن پارے کو عروج فراہم کرتا ہے۔ زیف سید نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ تاریخ اور تہذیب کی پیشکش میں پلاٹ پر قصہ یا قصہ نما حادثات واقعات ہی اپنا غلبہ قائم رکھیں جبکہ انہیں واقعات کی سجاوٹ انہوں نے بڑے اہم پہلوؤں سے کی ہے۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ جب ناول نگار کسی کردار کو تخلیق کرتا ہے تو بعض اوقات وہی کردار لوگوں کے مشاہدے میں براہِ راست موجود ہوتا ہے تو اب ایک ناول نگار کے لیے دقت آمیز لمحہ آتا ہے کہ وہ اس کردار کو فکشن کے رنگ میں کیسے پیش کرے، تو اس معاملے میں زیف سید بہت حد تک کامیاب رہے۔ خواہ شمس الدین کا کردار ہو یا احمد شاہ ابدالی کا ہر لحاظ سے انہوں نے ان کرداروں میں افسانیت کی

آمیزش کی ہے۔ ویسے تو جب اتنے بڑے کرداروں کو ناول نگار اپنے ناول کا حصہ بناتے ہیں تو ان میں کہانی کا رنگ بھرنے کے لیے مصنف کو بہت سے جتن کرنے پڑتے ہیں لیکن زیف سید نے اس معاملے میں بھی اپنے کمالِ فن کا بھرپور جواز پیش کیا ہے۔ زیف سید نے شمالی سرحد کی ثقافت کے کسی ایک پہلو کو حصہ نہیں بنایا بلکہ انہوں نے اس خطے میں سانس لیتی ہر زندگی کے ہر چلتے پھرتے لمحات کو اپنے ناول کا حصہ بنا دیا ہے اس لیے تو ان کا یہ ناول فنی اعتبار سے خاصہ جامع ہے۔ یہ ناول اپنے عہد کی مکمل داستان ہے اور اس سے جزوی اور کلی طور پر تاریخ کے ماخذ حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

حوالہ جات

1. Encyclopedia Americana, Vol 4, Glolier Incorporated, Dandbury, connecficut America 1982, p 202
2. Nathanial Harris,"History Around Us", The Hamlyn Publishing group, London,1979 ,p-7

۳۔ مبارک علی، تاریخی شعور، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص:۱۵۸

۴۔ بحوالہ اسد علی، ہندی ادب کے بھکتی کل پر مسلم ثقافت کے اثرات، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی، ۲۰۰۹، ص:۲۲

۵۔ وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۴ء، ص:۳۴

۶۔ ش اہد نواز، ناول میں عصری تاریخ کی پیش کش، (مضمون) مطبوعہ: جرنل آف ریسرچ (اردو)، شمارہ ۲۹، جون ۲۰۱۶ء، ص:۱۰۶

۷۔ زیف سید، گل مینہ، بک کارنر، جہلم، ۲۰۲۴ء، ص:۱۲

۸۔ زیف سید، گل مینہ، ص:۶۹

۹۔ ایضاً، ص ۱۹۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۹۴

۱۱۔ رویس احمد، گل مینہ، از زیف سید (تبصرہ)، ہم سب www.humsub.com.pk

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ نتاشا شاہد، دہشت گردی کی جڑ اور اس کی تاریخی نظیر، (مضمون)، مطبوعہ: سہ ماہی تجزیات، شمارہ ۶۷، ۲۰۰۷ء، اسلام آباد، ص:۸۰

References in Roman Script:

1. Encyclopedia Americana, Vol. 4. Danbury, Connecticut, America: Grolier Incorporated, 1982, p. 202.
2. Harris, Nathanial. History Around Us. London: The Hamlyn Publishing Group, 1979, p. 7.
3. Ali, Mubarak. Tarikhi Shaoor. Lahore: Fiction House, 2014, p. 158.
4. Asad Ali. Hindi Adab ke Bhakti Kal par Muslim Saqafat ke Asraat. New Delhi: Qaumi Council Baraye Farogh-e-Zaban-e-Urdu, 2009, p. 22.
5. Agha, Wazir. Urdu Shairi ka Mizaj. Aligarh: Educational Book House, 1974, p. 34.
6. Nawaz, Shahid. "Novel mein Asri Tarikh ki Pesh Kash." Journal of Research (Urdu), No. 29, June 2016, p. 106.
7. Syed, Zaif. Gul Meena. Jhelum: Book Corner, 2024, p. 12.
8. Syed, Zaif. Gul Meena, p. 69.

9. Ibid., p. 192.
10. Ibid., p. 294.
11. Ahmad, Ruwais. “Gul Meena az Zaif Syed (Tabsarah).” HumSub. www.humsub.com.pk.
12. Ibid.
13. Shahid, Natasha. “Dehshat Gardi ki Jar aur Us ki Tarikhi Nazir.” Tajziyat (Quarterly), No. 76. Islamabad, 2007, p. 80.